ایک حرف معذرت

وہ پہلے دن ہی شاہد کو اچھی لگی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ شاہد کی شخصیت میں جتنی بھی خامیاں تھیں وہ شازیہ کی شخصیت میں موجود نہیں تھیں، اور شازیہ کی ذات میں جتنی بھی خوبیاں تھیں وہ شاہد کے لئے پسندیدہ ترین تھیں۔ وہ دونوں ایم۔ اے کر رہے تھے۔ شاہد کا مضمون انگلش تھا جبکہ شازیہ کا پولیٹیکل سائنس۔ لاہور نیو کیمپس کی رومان پرور فضاؤں میں گزرنے والے وہ دن شاہد کے لئے حسین تر ہوتے چلے جا رہے تھے۔

شازیہ اس کی طرف مائل تھی اور وہ ایک ایسی لڑکی تھی جس کا مائل ہونا کسی بھی لڑکے کے لئے قابل فخر ہو سکتا تھا۔ وہ ایک صنعت کار گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اللہ نے اچھی شکل و صورت دی تھی اور جب امارت کی چمک بھی ہو تو رنگ روپ اور نکھر جاتا ہے۔ لمبا قد، دل میں اتر جانے والے نقوش، حسین تبسم اور سیاہ آنکھیں، جن میں شوخی اور ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ یقیناً وہ یونیورسٹی کی دلکش ترین لڑکی تھی۔ اور بات صرف جسمانی [illegible] نہیں تھی، اس کی شخصیت بھی دلکش تھی۔ وہ ہر کسی کے دکھ سکھ میں شریک ہوتی تھی۔ اس [illegible] ایک صفت یہ تھی کہ ہر کسی کے کام آتی تھی۔ اس لئے اس کے دوست بھی بہت تھے۔ بیڈمنٹن کی اچھی کھلاڑی تھی، زبردست مقرر تھی اور اس نے اس حوالے سے ملکی سطح پر بھی انعامات جیتے تھے۔ جو [illegible] ملتا تھا اس کی ہمہ جہت شخصیت کے سحر میں گرفتار ہو جاتا تھا۔ شاہد کا حال بھی یہی تھا۔ لیکن وہ اس اعتبار سے خوش قسمت نوجوان تھا۔ شازیہ بھی اس سے متاثر ہوئی تھی۔ شاہد ایک وجیہہ نوجوان تھا۔ متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا تھا، والد فوت ہو چکے تھے، دو بہنوں کی شادی ہو چکی تھی [illegible] والدہ کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے والد سرکاری ملازم رہے تھے تاہم انہوں نے اپنا ایک چھوٹا سا بزنس بھی اسٹیبلش کر رکھا تھا۔ وہ لیدر جیکٹس بناتے تھے۔ والد کی وفات کے بعد یہ بزنس شاہد کے چچا دیکھتے تھے۔ اس بزنس سے شاہد اور اس کی والدہ کو اتنی آمدن ہو جاتی

تھی کہ اُن کی گزر بسر با آسانی ہو رہی تھی۔

شاہد کے مقابلے میں شازیہ کو ہر لحاظ سے فوقیت حاصل تھی۔ اسٹیٹس، دولت، خاندانی پس منظر، شخصی خوبیاں، غرض ہر لحاظ سے وہ شاہد سے برتر نظر آتی تھی۔ لیکن ایک جذبہ ایسا تھا جس نے ان دونوں کو ایک سطح پر لا کھڑا کیا تھا اور وہ جذبہ محبت کا تھا۔ خبر نہیں شازیہ کو شاہد میں کیا بات نظر آئی تھی کہ وہ اُس کی طرف کھنچی چلی جا رہی تھی۔ وہ دونوں اکثر کیفے ٹیریا میں بیٹھے نظر آتے۔ کبھی نہر کے ساتھ ساتھ سفیدے کے خاموش درختوں کے نیچے چہل قدمی کرتے دُور نکل جاتے۔ کبھی سبزہ زار کی نرم دُھوپ میں بظاہر کتابوں پر جھکے نظر آتے۔ لیکن حقیقت میں راز و نیاز کرتے رہتے۔

شازیہ کہتی۔ ''شاہد! تم اپنے بال تھوڑے چھوٹے کرا دو۔''

''کیوں؟''

''بالکل ہپّی لگتے ہو۔''

''میرے خیال میں تو ایسا نہیں ہے۔ اور اگر ہے بھی تو اس میں کیا مضائقہ ہے؟''

''مضائقہ ہے۔ اگر تم ہپّی لگو تو مجھے بھی مادھوری لگنا چاہئے۔'' وہ ہنسی۔

''تو تم کسی مادھوری شادھوری سے کم ہو؟''

''واقعی؟'' اُس کی آنکھوں میں شوخی اُبھری۔

''اگر تنہائی ہوتی تو میں تمہیں اپنے احساسات کا عملی ثبوت فراہم کرتا۔ لیکن یہاں سرِ عام کیا ہو سکتا ہے؟''

وہ شرم سے سرخ ہو جاتی۔ لیکن لاجواب ہونا تو اُسے آتا ہی نہیں تھا۔ کوئی نہ کوئی ایسا جواب دیتی کہ شاہد بغلیں جھانک کر رہ جاتا۔

اُس کی حاضر جوابی کبھی کبھی اتنی واشگاف ہوتی کہ حساس طبع شاہد خفا ہو جاتا۔ وہ اُس کی خفگی کو فوراً محسوس کر لیتی لیکن جان بوجھ کر انجان بنی رہتی۔ دو تین دن تک دُور دُور سے اُس کی خفگی کا مزہ لیتی، پھر جونہی کوئی مناسب موقع ملتا اُسے منا لیتی۔ منانے کی ذمہ داری ہمیشہ شازیہ کی ہی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ کہتی۔ ''اگر میں رُوٹھ گئی تو منا نہیں سکو گے۔ بندے کو رُوٹھنے کی ہی نہیں، منانے کی پریکٹس بھی ہونی چاہئے۔''

وہ کہتا۔ ''اچھا رُوٹھ کر تو دیکھو۔''

''میں پاگل ہوں؟'' وہ جواب دیتی۔ ''ساری عمر بھی روٹھی رہوں گی تو نہیں مناؤ گے۔ اچھی طرح جانتی ہوں تمہیں۔'' دونوں ہنسنے لگے۔

ایک موقع پر اُن کی ناراضگی کچھ طویل ہوگئی۔ شاید درمیان میں بڑی عید کی چھٹیاں آ گئی تھیں۔ چھٹیوں کے بعد جب یونیورسٹی کھلی اور وہ لوگ کیمپس میں پہنچے تو شاہد کا موڈ بری طرح خراب تھا۔ اُس نے دو تین روز شازیہ کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ پیریڈ ختم ہوتے ہی وہ خاموشی سے نکل جاتا یا لائبریری میں جا کر بیٹھ جاتا۔ ایک دن شازیہ کو پتا چل گیا کہ وہ لائبریری میں چھپا بیٹھا ہے۔ وہ خاموشی سے وہاں آ پہنچی۔ جب اُس نے اپنا ہینڈ بیگ کھٹاک سے میز پر رکھا تو شاہد بری طرح چونک گیا۔ وہ سامنے کھڑی تھی اور شوخ نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُس کی یہی شوخ نظریں تھیں جو شاہد کا آدھا غصہ بھاپ بنا کر اُڑا دیتی تھیں۔ باقی آدھا غصہ اُس کی خوبصورت باتوں سے دور ہو جاتا تھا۔

وہ خاموشی سے اُس کے پاس بیٹھ گئی۔ اُس کی تیز نظریں شاہد کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ شاہد بالکل لاتعلق تھا اور کتاب پر نگاہیں جمائے ہوئے تھا۔ کئی بار تو شازیہ کا یوں مسلسل دیکھنا ہی شاہد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آتا تھا۔ لیکن آج اُس کا غصہ معمول سے کچھ زیادہ ہی تھا لہٰذا وہ پتھر کا بت بنا بیٹھا رہا۔

وہ پچکارنے والے انداز میں بولی۔ ''نالاض ہو؟'' (ناراض ہو؟)

وہ خاموش بیٹھا رہا۔

''کیھی نے مالا ہے؟'' (کسی نے مارا ہے؟)

وہ خاموش رہا۔

''ہائے میں مر جانواں۔ یہ تو کچھ زیادہ ہی گڑبڑ ہے۔'' وہ خودکلامی کے انداز میں بولی۔ پھر کھنکار کر گلا صاف کیا اور دوبارہ پچکارنے والے لہجے میں کہنے لگی۔ ''منا چیجی کھائے گا؟''

شاہد ایک دم بھڑک گیا۔ پھنکارتی ہوئی مدھم آواز میں بولا۔ ''تمہیں شرم بھی نہیں آتی۔ جاؤ! کام کرو اپنا۔''

وہ بلاتوقف بولی۔ ''کام ہی تو کر رہی ہوں۔ تمہارا کام روٹھنا ہے اور میرا کام منانا۔

"نہیں منانے سے اہم کام میرے لئے اور کیا ہو سکتا ہے؟ کہو تو ساری عمر بیٹھ کر مناتی رہوں تمہیں۔"

شاہد نے جیسے اُس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ اور سر دوبارہ کتاب پر جھکا دیا۔ وہ ایک بار پھر ایک ٹک شاہد کو گھورنے لگی۔ شاہد بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ اس کیفیت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اُس نے منہ سے دو تین بار "چھچ چھچ" کی آواز نکالی۔ انداز وہی تھا جو شیر خوار بچے کو ہنسانے کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔ شازیہ کا داؤ اکثر کارگر رہتا تھا لیکن آج ایسا نہیں ہوا۔ وہ اُسے مسلسل دیکھتے ہوئے بولی۔ "منا ابھی کھِلکھلائے گا۔ منا ابھی ہنس پڑے گا۔"

وہ پتھر کا بت بنا بیٹھا رہا۔ مگر وہ بھی ہار ماننے والی کہاں تھی؟ کوشش میں لگی رہی۔ یہاں تک کہ بہت ضبط کے باوجود ایک بے اختیار مسکراہٹ شاہد کے لبوں پر آ ہی گئی۔

وہ دن ایسی ہی خوشگوار یادوں سے عبارت تھے۔ اُن کی محبت کا چرچا پوری یونیورسٹی میں تھا۔ بلکہ یونیورسٹی سے باہر بھی یہ خوشبو پھیل چکی تھی۔ شازیہ نے اپنے گھر والوں کو بھی بتا دیا تھا کہ وہ شاہد کو پسند کرتی ہے۔ شازیہ کے والد امریکہ میں مقیم تھے۔ سنا تھا کہ وہاں انہوں نے دوسری شادی کر رکھی ہے۔ وسیع کاروبار اور جائیداد کا سارا انتظام شازیہ کی والدہ کے ہاتھ میں تھا۔ اُس کی والدہ مسز ثریا احسان ایک مشہور و معروف سوشل ورکر تھیں۔ اُن کی نیک نامی اور خدا ترسی کا چرچا دُور دراز تک تھا۔ ایک ہسپتال اور دو تین سکولوں کے علاوہ کئی فلاحی ادارے بھی اُنہوں نے قائم کئے تھے اور بے شمار ضرورت مندوں کی سرپرستی کر رہی تھیں۔ فلاحی کاموں کا شوق اور دوسروں کے کام آنے کا جذبہ شازیہ کو یقیناً والدہ سے ہی ورثے میں ملا تھا۔ اور یہی رویہ تھا جس نے شازیہ کو کم عمری میں ہی ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ ایک ایسا سحر پیدا کر دیا تھا اُس کی شخصیت میں کہ ہر ایک اُس کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ اور وہ خود شاہد کی گرویدہ تھی۔

شاہد نے تنہائی میں بیٹھ کر کئی بار سوچا تھا کہ اس میں کون سی خاص بات ہے جس نے اُسے اور شازیہ کو ایک دوسرے سے قریب کیا ہے۔ بلاشبہ وہ مردانہ حسن کا مالک تھا۔ خوش اخلاق اور ذہین تھا لیکن کوئی غیر معمولی صلاحیت تو اُس میں نہیں تھی۔ وہ کئی اعتبار سے شازیہ کی ضد تھا۔ وہ ملنسار تھی، وہ کم آمیز تھا۔ وہ خوش گفتار تھی، وہ خاموش طبع تھا۔ وہ بے

حد دولت مند تھی، وہ معمولی حیثیت کا مالک تھا۔ اُن کا خاندانی پس منظر بھی ایک دوسرے سے بالکل جدا تھا۔ پھر بھی وہ روز بروز اُس کی طرف کھنچی جا رہی تھی اور وہ بھی کھنچا جا رہا تھا۔ شاید ایک دوسرے کی ضد ہونا بھی ایک دوسرے کے لئے کشش کا باعث بن جاتا ہے۔ جیسے یہ حسابی کلیہ کہ "مائنس مائنس پلس۔"

اور پھر ایک روز یہ مائنس مائنس سچ مچ پلس ہو گئے تھے۔ ساری رُکاوٹیں، سارے مسائل دُور کر کے شازیہ اور شاہد نے ایک دوسرے کو پالیا۔ شازیہ شہنائیوں کی گونج میں شازیہ شاہد بن کر اُس کی مختصر کوٹھی میں آ گئی جہاں شاہد اپنی والدہ کے ساتھ رہتا تھا۔ شازیہ اور شاہد کی زندگی کا ہر دن عید اور ہر رات شب برات تھی۔ وہ محبت کے جھولوں میں یوں جھول رہے تھے کہ اپنے گرد و پیش کی ہر چیز کو فراموش کئے ہوئے تھے۔

اُنہی دنوں شازیہ کی والدہ مسز ثریا احسان کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ اُنہیں دل کی تکلیف تو پہلے سے تھی۔ ایک اٹیک بھی ہو چکا تھا مگر بظاہر وہ تندرست ہی نظر آتی تھیں۔ اُن کی مصروفیت اتنی زیادہ تھی کہ وہ بیمار نظر آ ہی نہیں سکتی تھیں۔ لیکن یہ مصروفیت اندر ہی اندر اُنہیں نقصان پہنچا رہی تھی۔ ہسپتال اور سکولز کی ذمہ داریاں، رفاہی اداروں کی دیکھ بھال، مختلف تقریبات میں شرکت، یہ ایک ایسی بھاگ دوڑ تھی جو ان کی بیماری سے ہرگز مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اُن پر دل کا دوسرا شدید حملہ ہوا اور وہ بستر کی ہو کر رہ گئیں۔ شازیہ کے والد احسان صاحب امریکہ میں تھے۔ شازیہ کے سوا کوئی اولاد بھی نہیں تھی جو اُن کی دیکھ بھال کرتی۔ بے شک نوکروں کی فوج ظفر موج موجود تھی لیکن مریض کو جو راحت اپنوں سے مل سکتی ہے وہ غیروں سے نہیں ملتی۔ شازیہ والدہ کی تیمارداری میں لگ گئی۔ جب مرض کی طوالت کے سبب اس تیمارداری نے طول پکڑا تو مسز ثریا نے شاہد سے درخواست کی کہ وہ اپنی والدہ کے ساتھ ان کے گھر میں منتقل ہو جائے۔ وہ چاہتی تھیں کہ بیٹی اور داماد اُن کی آنکھوں کے سامنے رہیں اور اُنہیں اتنے بڑے گھر میں تنہائی اور بیماری سے بیک وقت نبرد آزما نہ ہونا پڑے۔ شروع میں تو شاہد کو یہ بات مناسب نہیں لگی لیکن جب شازیہ اور مسز ثریا کا اصرار بڑھتا گیا تو اُن کی خوشی کے لئے وہ مان گیا۔ یوں اپنی شادی کے تین چار ماہ بعد ہی شاہد اور اُس کی والدہ مسز ثریا کے وسیع و عریض گھر میں منتقل ہو گئے۔ یہ گھر گلبرگ کے بہترین رہائشی "فیز" میں واقع تھا۔

شاہد نے ایم۔اے امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا۔ اُسے ایک اشاعتی ادارے میں ابھی ملازمت ملی تھی۔ شازیہ تو یہ چاہتی تھی کہ وہ اُن کی کسی فیکٹری میں ہی اپنی پسند کا منصب سنبھال لے لیکن شاہد کو یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔ وہ بہت حد تک قناعت پسند اور کام سے کام رکھنے والا شخص تھا۔ کوئی بہت زیادہ خواہشات نہیں تھیں اُس کی۔ ایک باعزت روزگار، ایک خوبصورت پیار کرنے والی بیوی اور دو یا تین بچے، بس یہی اُس کا مستقبل کا پلان تھا۔

خوبصورت اور پیار کرنے والی بیوی تو اُسے مل گئی تھی لیکن وہ دیگر حالات سے مطمئن نہیں تھا۔ سب سے بڑا مسئلہ تو یہی تھا کہ اُس کی خوبصورت پیار کرنے والی بیوی کو ''پیار کرنے'' کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ اُن کا ہنی مون تو خیر ٹھیک سے گزر گیا تھا لیکن اس کے بعد شازیہ کی مصروفیات مسلسل بڑھتی گئی تھیں۔ والدہ کی بیماری کی وجہ سے وہ بتدریج عدیم الفرصت ہوگئی تھی۔ پہلے اُسے صرف والدہ کی تیمارداری کرنا پڑ رہی تھی، پھر اُسے وہ کام بھی کرنا پڑے جو والدہ کی بیماری کی وجہ سے اٹکے ہوئے تھے یا ان کا کیا جانا بہت ضروری تھا۔ کاروبار کا حساب کتاب، ٹیکس کے معاملات، رفاہی اداروں کی صورتحال۔ بے شک مسز ثریا کے منیجر اور اسسٹنٹ وغیرہ شازیہ کی مدد کر رہے تھے اور وہ پہلے سے ان معاملات کی تھوڑی بہت سمجھ بھی رکھتی تھی لیکن پھر بھی یہ سب کچھ بہت دُشوار تھا۔ شازیہ نے اپنے والد کو خط لکھا کہ وہ کسی طرح پاکستان آ جائیں۔ وہاں سے خاصی تاخیر کے بعد جو جواب آیا وہ یہ تھا کہ وہ ابھی چار پانچ ماہ تک کسی صورت یہاں سے نہیں نکل سکتے۔ اُنہوں نے اپنی کچھ مجبوریاں بتائیں جو اپنی جگہ درست محسوس ہوتی تھیں۔ شازیہ کی مصروفیات شاہد کے لئے بھی پریشان کن تھیں۔ اُس نے شروع شروع میں شازیہ کا بوجھ بانٹنے کی کوشش کی اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوگیا۔ لیکن جلد ہی اُسے اندازہ ہوگیا کہ وہ ان سارے معاملات میں ''مس فٹ'' ہے۔ ویسے بھی شازیہ بڑی تیزی کے ساتھ اپنے معمولات سے مطابقت پیدا کرتی چلی جارہی تھی اور یوں لگتا تھا کہ ایک دو ماہ میں یہ سب کچھ اُس کے لئے ''روٹین'' بن جائے گا۔ ہسپتال کی ذمہ داری اُس نے نہایت قابل ڈاکٹر اقبال درانی کے سپرد کر دی تھی۔ اقبال درانی انتظامی صلاحیتیں رکھنے والا ایک بے حد فعال شخص تھا۔ اسی طرح احسان سکولز کا انتظام و انصرام

ایک تجربہ کار ہیڈ مسٹریس کے تعاون سے شازیہ خود چلانے لگی تھی۔ اپنی گوناگوں مصروفیات میں سے وقت نکال کر وہ رفاہِ عامہ سے تعلق رکھنے والی مختلف تقریبات میں بھی شرکت کرتی تھی۔ کبھی کسی ڈسپنسری یا سکول کا افتتاح، کبھی کوئی واک، کبھی کوئی سیمینار۔ وہ ان ہنگاموں میں بتدریج گم ہوتی چلی جارہی تھی، بالکل جیسے وہ یونیورسٹی کے دنوں میں نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں گم رہتی تھی۔

شاہد اُس کی دید کے لئے ترس جاتا تھا۔ وہ شام چھ بجے کے لگ بھگ دفتر سے گھر جاتا تھا۔ شازیہ کی واپسی کسی صورت بھی آٹھ نو بجے سے پیشتر نہیں ہوتی تھی۔ گھر آ کر بھی اُسے ایک ڈیڑھ گھنٹہ اپنی والدہ کے پاس گزارنا ہوتا تھا۔ شاہد ''ارلی رائزر'' تھا اس لئے جلدی سو جاتا تھا۔ جب شازیہ اپنی مصروفیات سے نمٹ کر خواب گاہ میں پہنچتی تھی تو شاہد سو رہا ہوتا تھا یا سونے کے قریب ہوتا تھا۔ وہ خود تھکی ماندی ہوتی تھی پھر بھی کوشش کرتی کہ شاہد سے بات کرے، اُسے وقت دے۔ لیکن اُس کی یہ خواہش حقیقی اُمنگ ترنگ سے خالی ہوتی تھی۔ شاہد کو محسوس ہوتا کہ وہ بہ امر مجبوری ایسا کر رہی ہے۔ وہ ایک دم بیزار سا ہو جاتا۔ ایک ہی بستر پر ہونے کے باوجود وہ شازیہ سے بہت دُور چلا جاتا تھا۔ شازیہ سے اُس کی گفتگو رسمی انداز اختیار کر لیتی تھی اور پھر بہت جلد وہ کروٹ بدل کر سو جاتا تھا۔

کئی ہفتے مسلسل یہ مشق جاری رہی۔ آخر ایک دن شازیہ کو شدت سے اس خلا کا احساس ہوا جو ان دونوں کے درمیان روز بروز وسیع ہوتا جارہا تھا۔ ایک روز وہ سرِ شام گھر آ گئی۔ اُس نے گلابی رنگ کی خوبصورت ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بال کھلے چھوڑ رکھے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں کاجل کے ساتھ نشہ سا تیرتا محسوس ہو رہا تھا۔ آج وہ ہمیشہ سے زیادہ جاذبِ نظر دکھائی دے رہی تھی۔

شاہد نے جیسے اُسے دیکھ کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ خاموشی سے شام کا اخبار پڑھنے میں مصروف رہا۔ وہ پیچھے سے آئی اور بڑی ادا سے شاہد کے کان کے پاس اپنی چوڑیاں بجائیں۔

''کیا بات ہے؟'' نظریں اخبار پر جمائے جمائے بولا۔

''بڑی خاص بات ہے۔'' اُس نے چنچل لہجے میں کہا۔

''ظاہر ہے خاص بات ہی ہوگی۔ تمہارے جیسی مصروف عورت کا سرِ شام گھر آ جانا

ایسی تو نہیں ہوگا۔"

اُس نے پیچھے سے شاہد کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ ایک نرم گرم خوشبو دار لمس نے شاہد کو اپنے اندر جذب کرنا چاہا لیکن وہ بے حس وحرکت بیٹھا رہا۔

"نالاج ہو مجھ سے؟" اُس نے حسب عادت کان میں سرگوشی کی۔ وہ خاموش رہا۔
وہ شرارت سے بولی۔"ہائے اللہ، اتنا پیالا پیالا منہ اور نجھے چھے اتنا خلاب (خراب) کرلیا ہے۔"

"مجھے نہیں اچھی لگتی یہ مسخری۔" شاہد نے ڈپٹ کر کہا اور جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔
کچھ دُور جا کر وہ صوفے پر لیٹ گیا۔ شازیہ نے جلدی سے اسٹڈی رُوم کا دروازہ اندر سے بند کیا اور شاہد کے قریب ہو بیٹھی۔"پلیز شاہد! میری مجبوریوں کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے بھی تم سے دُور نہ جاؤں۔ لیکن کیا کروں، کوئی چارہ ہی نہیں۔ کم از کم پاپا کے آنے تک تو بری طرح پھنسی ہوئی ہوں۔"

"تو ٹھیک ہے۔ جب تمہارے پاپا آ جائیں تو آ جانا میرے پاس۔ میں کل ہی امی کے ساتھ گھر جا رہا ہوں۔"

"پلیز شاہد!" اُس نے شاہد کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔"ایسی بات مت کرو! ممی کا دل ٹوٹ جائے گا۔ تمہیں پتا نہیں تمہاری اور خالہ کی وجہ سے وہ کتنی خوش رہتی ہیں۔ تم چلے گئے تو وہ اپنے آپ سے مایوس ہو جائیں گی۔ تم دیکھ ہی رہے ہو، مجھے سارا دن گھر سے باہر رہنا پڑتا ہے۔ ایسے میں خالہ (شاہد کی امی) کی وجہ سے اُن کا دل لگا رہتا ہے۔ پھر شام کو تم بھی دفتر سے آ جاتے ہو۔ ہم تینوں کو وہ اپنا سمجھتی ہیں۔ جو راحت ہم انہیں دے سکتے ہیں، کوئی نہیں دے سکتا۔

شازیہ کی باتیں اس چمکیلی دُھوپ جیسی ہوتی تھیں جو موسم سرما کی ساری سیلن اور نمی کو در و دیوار سے چوس لیتی ہے۔ ان باتوں کو سن کر اُس کی مکدر طبیعت آئینے کی طرح صاف وشفاف ہو جاتی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ بھول ہی جاتا تھا کہ وہ کس بات پر اتنا خفا تھا؟ اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ شازیہ کی بانہوں میں گھر کر، اُس کی سانسوں سے ٹکرا کر، اُس کے ہونٹوں کو چھو کر شاہد کا سارا غم وغصہ ریزہ ریزہ ہو گیا۔ شازیہ نے ایک دل نواز ادا سے خود کو شاہد کی وارفتگی کے سپرد کر دیا۔ اُن کی زندگی کی یادگار راتوں میں ایک اور رات کا

اضافہ ہوگیا !!

زندگی میں ایسی راتیں آتی رہیں اور ان کے ساتھ ساتھ وہ بے شمار راتیں بھی آتی رہیں جن کی محرومیاں بے شمار اور جن کے غم لامتناہی تھے۔ غم واقعی طویل ہوتے ہیں اور خوشیاں مختصر۔ پانچ چھ ماہ گزرنے کے باوجود شازیہ کے پاپا امریکہ سے نہیں لوٹ سکے تھے۔ شازیہ کی مصروفیت بڑھتی جا رہی تھی۔ اب تو کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ اُن کی ملاقات صرف ناشتے کی میز پر ہو پاتی تھی۔ یہ ملاقات ایسی ہی ہوتی تھی جیسے ٹریفک سگنل کی وجہ سے دو گاڑیاں چند سیکنڈ کے لئے ایک دوسرے کے پہلو میں رُکیں اور پھر اپنے اپنے راستے پر آگے بڑھ جائیں۔ شادی کے آٹھ دس ماہ بعد ہی ایسی صورتحال پیدا ہو جانا بہت افسوس ناک تھا۔ خاص طور پر شاہد کے لئے۔ بہرحال وہ شازیہ کی مجبوریاں سمجھتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اُس سے پیار کرتی ہے اور اس کا ثبوت وصل کے وہ لمحے تھے جنہیں شازیہ بڑی تگ و دو سے حاصل کرتی تھی اور جنہیں شاہد کے لئے یادگار بنا دیتی تھی۔ کسی وقت تو شاہد کو اُس پر ترس آنے لگتا تھا۔ خصوصاً جب سے اُس کا پاؤں بھاری ہوا تھا، اس کا خیال ہر وقت شاہد کے ذہن میں رہتا تھا۔ اُسے آرام کی ضرورت تھی مگر وہ حالات کے جس چکر میں پھنسی ہوئی تھی اس میں چاہتی بھی تو مناسب آرام نہیں کر سکتی تھی۔ وہ انجانے میں اور بالکل غیر محسوس طور پر اپنی والدہ کی جگہ لے چکی تھی۔ لوگوں کو اب اس سے وہی توقعات تھیں جو اُس کی والدہ مسز ثریا سے تھیں۔ مختلف لوگ مختلف انداز میں اپنے دکھوں کے مداوے کے لئے شازیہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں غریب بیوائیں تھیں، یتیم بچے تھے، اپاہج افراد تھے، شادی کی عمر کو پہنچی ہوئی مفلس گھرانوں کی لڑکیاں تھیں، وہ بیمار تھے جن کی زندگی کے ٹمٹماتے چراغوں کو مسز ثریا نے اپنے ہاتھوں کے ہالے میں لے رکھا تھا۔ اب یہ بے شمار لوگ شازیہ کی ذمہ داری بنتے جا رہے تھے۔ یہ حالات تھے جن میں شازیہ اور شاہد کی محبت کی نشانی ایک ہمکتے ہوئے وجود کی صورت میں دنیا میں آئی۔ اس کا نام ارسلان رکھا گیا۔ ارسلان کے آنے سے شاہد کی حد سے بڑھی ہوئی قنوطیت میں کچھ کمی واقع ہوگئی۔ وہ دفتر سے آ کر ارسلان سے دل بہلاتا۔ رات کو جب شازیہ گھر آتی تو وہ دونوں کافی وقت ارسلان کے ساتھ گزارتے۔ تعطیل کا تو سارا دن ہی ارسلان کے لئے وقف ہوتا تھا۔ انگریز آیا کو اُس روز چھٹی دے

ن جاتی۔ شازیہ اور شاہد ارسلان میں محو ہو جاتے اور کوشش کرتے کہ ہفتے بھر کی کسر ایک
ن روز نکل جائے۔ لیکن محبت وقت کی پابند کہاں ہوتی ہے؟ یہ بھوک نہیں جو وقت پر لگے
اور نہ نیند ہے جو وقت پر آئے۔ یہ تو ایک لہر ہے، کون جانے سمندر میں کب اور کہاں سے
اٹھے گی؟ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ یہ لہر ایک مقررہ وقت پر ہی اُٹھے تو وہ نادان ہے۔ بچے
دل کسی بھی وقت ماں کے لئے مچل سکتا ہے۔ باپ کی آغوش کسی بھی وقت بچے کے
لئے بے تاب ہو سکتی ہے۔ شوہر کی بانہیں کسی بھی وقت اپنی شریک حیات کو ڈھونڈ سکتی
ہیں محبت لنچ یا ڈنر نہیں، محبت تو چنچل ہوا کی دستک ہے۔

اُنہی دنوں شازیہ کی والدہ مسز ثریا ایک طویل علالت کے بعد وفات پا گئیں
لاہور میں موجود بیشتر جائیداد اُنہی کے نام تھی۔ کاروبار بھی ان کے پاس تھا۔ اُن کی
وصیت کی رو سے اُن کی وفات کے بعد یہ سب کچھ اُن کی اکلوتی اولاد شازیہ کو مل گیا۔
والدہ کے بعد شازیہ کی ذمہ داریاں مزید بڑھ گئیں۔ اب وہ کلی طور پر مسز ثریا کی جگہ لے
چکی تھی۔ وہ ایک بڑے بزنس کی مالکہ ہونے کے علاوہ ایک معروف اور نیک نام سوشل
ورکر بھی تھی۔ اُس کی تصویریں اور انٹرویوز اخباروں میں چھپتے تھے۔ ذرائع ابلاغ اُس کی
مصروفیات کو کوریج دیتے تھے۔ شازیہ کی عمر ابھی کم تھی لیکن کچھ حلقے اُسے ابھی سے
سیاست میں گھسیٹنا چاہ رہے تھے۔ اُنہیں مکمل یقین تھا کہ وہ اس علاقے سے مستقبل کی
ایم این اے ہے۔ الیکشن کے دنوں میں شازیہ کی مصروفیات بڑھ گئیں۔ اپنی مرحومہ
والدہ کی روایت پر عمل کرتے ہوئے اُسے ایک پارٹی کے اُمیدوار کی حمایت کرنا تھی۔
جوں جوں الیکشن کے دن نزدیک آتے گئے، شازیہ، شاہد اور اپنے بچے سے دُور ہوتی
گئی۔ وہ بڑی کوشش سے اپنے لئے فرصت کا جو وقت ڈھونڈتی تھی اس میں بھی دخل در
معقولات جاری رہتی تھی۔ اُن کی خواب گاہ بھی ان چاہی دستکوں اور فون کالز سے محفوظ
نہیں تھی۔ کسی وقت جب اُن کی خلوت کے لمحات بھی کسی دستک یا کال سے متاثر ہو
جاتے تو شاہد بری طرح تلملاتا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُسے شازیہ پر ترس بھی آتا۔ وہ
بری طرح جکڑی ہوئی تھی۔ کسی وقت شاہد کی تلملاہٹ پر ترس غالب آجاتا اور کسی وقت
ترس پر تلملاہٹ غلبہ پالیتی۔

وہ ویک اینڈ کی رات تھی۔ شازیہ اور شاہد اپنے بیڈ رُوم میں تھے۔ دو تین ہفتوں بعد

اُنہیں مل بیٹھنے کا وقت ملا تھا۔ شازیہ نے ٹیلی فون کا Ringer بند کر دیا تھا اور پرسنل سیکرٹری عائشہ کو ہدایت کی تھی کہ وہ کسی کی کال بھی نہیں ملائے گی۔ جب وہ اس طرح ہر طرف سے کان اور آنکھیں بند کر کے اُس کی بانہوں میں سما جاتی تھی تو اُسے بہت اچھی لگتی تھی۔ شاہد اُس کی گھنی زلفوں کی چھاؤں میں آنکھیں موند لیتا تھا اور اُس کے بدن میں ٹوٹے ہوئے کانٹے وہ اپنی پلکوں سے چننے لگتی تھی۔ بے تاب عشق اور پرشباب حسن کا یہ ملاپ دیر بعد ہوتا تھا لیکن جب بھی ہوتا تھا، خوب ہوتا تھا۔ وہ بھی ایسی ہی حسین گھڑیاں تھیں۔ شاہد کے تمام شکوے گرم گرم سانسوں اور ریشمی سرگوشیوں کی گونج میں مدغم ہو رہے تھے کہ اچانک دروازے پر ہونے والی مدھم دستک نے اُنہیں چونکا دیا۔

''کون؟'' شازیہ نے ہانپی ہوئی سی آواز میں پوچھا۔

''میں عائشہ ہوں۔'' سیکرٹری کی آواز آئی۔

''کیا بات ہے؟''

''ڈاکٹر درانی آئے ہیں، کہتے ہیں بے حد ضروری بات کرنی ہے۔ میں نے بہت منع کیا لیکن وہ کہتے ہیں چار پانچ منٹ سے زیادہ وقت نہیں لوں گا۔''

''یا خدا! کیا مصیبت ہے۔'' وہ بڑبڑائی۔ پھر اُس نے اُٹھ کر لباس درست کیا، بال سمیٹے، لائٹ جلا کر آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ شاہد سے بولی۔ ''بس پانچ منٹ میں آتی ہوں۔''

''مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا میرے کہنے سے رُک جاؤ گی؟'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

''او نو!'' اُس نے ادا سے کہا اور پیچھے سے اُس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ وہ بیڈ پر بیٹھا تھا، وہ کھڑی تھی۔ کچھ دیر وہ یونہی ایک دوسرے سے پیوست رہے، پھر وہ اُس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔ ''بہت بے صبرے ہو تم ویری امپیشنٹ۔'' اُسے شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ باہر چلی گئی۔

اُس نے صورتِ حال کو ہلکے پھلکے انداز میں لیا تھا۔ لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ شاہد اندر ہی اندر کڑھ کڑھ کر کتنا جل بھن چکا ہے۔ اُسے شازیہ کی شہرت کی ضرورت تھی نہ سیاست کی اور نہ دولت کی۔ وہ تو بس اُسے چاہتا تھا۔ اُسے اپنے قریب رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ روز بروز دور ہوتی جا رہی تھی۔ اب بھی وہ صرف پانچ منٹ کے لئے گئی تھی لیکن یہ پانچ

ٹ لویل ہوتے چلے گئے۔ پہلے دس منٹ بنے، پھر پندرہ منٹ اور پھر تیس منٹ۔
ایک دن شازیہ اور درانی کی باتیں ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھیں۔ شاہد کے اندر
غصے کی جو آگ دھیرے دھیرے کئی دنوں سے سلگ رہی تھی، ایک دم بھڑک کر الاؤ
بن گئی۔ ایکا ایکی اُس کا ضبط جواب دے گیا۔ اُس نے کپڑے بدلے، چند ضروری
چیزیں لیں اور خواب گاہ سے نکل آیا۔ قریبی چوک سے اُسے ٹیکسی مل گئی، وہ سیدھا اپنے
ماں کے گھر آ گیا۔

وہ فطرتاً ایک سکون پسند شخص تھا اور اس گھر میں اُس کا دلی سکون تباہ ہوتا چلا جا رہا
تھا۔ اگلے روز صبح سویرے شاہد کی والدہ اُسے منانے کے لئے پہنچ گئیں۔ وہ بہت دیر
اُسے سمجھاتی رہیں۔

"بیٹا! تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ تم سے محبت کرتی ہے لیکن اُس کی مجبوریاں ہیں۔ اور
وہ کوئی برا کام بھی نہیں کر رہی۔ ہم اُسے کیسے منع کر سکتے ہیں؟ یہ تو بڑی نیکی ہے۔ میں تو
چاہتی ہوں تم بھی اُس کا ہاتھ بٹاؤ۔ جو اللہ کے بندوں کے کام آتا ہے، اللہ اُس کی مشکلیں
آسان کرتا ہے۔ اُس سے خوش ہوتا ہے۔"

"امی! آپ کو کچھ پتا نہیں۔" شاہد بھڑک کر بولا۔ "یہ اللہ کی خوشنودی کا کام نہیں۔ یہ
سیاست بازی ہے۔ یہ جسے آپ خدا ترسی کہہ رہی ہیں یہ سیاست کی پہلی سیڑھی ہے۔ ہر
سیاست دان شروع میں خدا ترس یا سوشل ورکر ہی ہوتا ہے۔ مجھ سے نہیں ہو سکتا یہ سب
کچھ۔ میں اُس کا سایہ بن کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ کیا آپ چاہتی ہیں کہ میں اُس کی ہدایتوں
پر عمل کرتے ہوئے لوگوں میں کمبل بانٹوں، سائیکلیں اور سلائی مشینیں تقسیم کروں،
انٹرویوز دوں اور تقریریں کروں؟ مجھ سے نہیں ہو سکتا یہ سب کچھ۔ میں جیسا ہوں، ویسا
ہی ہوں اور رہوں گا۔"

ماں نے کہا۔ "بیٹا! تم فیصلہ کرنے میں بہت جلدی کرتے ہو۔ حوصلہ رکھو! آہستہ
آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کچھ ٹھیک نہیں ہوگا۔" وہ بیزاری سے ہاتھ جھٹک کر بولا۔ "آخر کو وہ اپنی ماں کی
بیٹی ہے نا۔ جو حال اُس کی والدہ نے اپنے شوہر کا کیا تھا، وہی حال یہ میرا کرے گی۔
جیسے وہ سات سمندر پار جا کر بیٹھ گیا ہے، شاید مجھے بھی کنارہ ہی کرنا پڑے۔ یہ سوشل

ورکر اور سیاست دان قسم کی ساری عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ دوسروں کی زندگیاں سنوارتی پھرتی ہیں، چاہے اپنا گھر برباد ہو جائے۔''

''نہیں بیٹا نہیں۔'' ماں نے جلدی سے کہا۔ ''پانچوں اُنگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ تم شاید فلموں، ڈراموں کی باتیں کر رہے ہو جہاں ایسی عورتوں کو بدنام کیا جاتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ غیر ذمہ دار اور گھر سے بے پرواہ ہوتی ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے۔ کم از کم ہماری شازیہ تو ایسی ہرگز نہیں اور نہ ہی وہ سیاست باز ہے۔ میں سچ کہتی ہوں، اُس کے دل میں ہمدردی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور تم شازیہ کے والد کے بارے میں جو اندازے لگا رہے ہو وہ بھی غلط ہیں۔ میرے خیال میں اس جھگڑے میں صرف بہن ثریا کا ہی قصور نہیں تھا۔''

''بس آپ تو شازیہ اور اس کی ماں کی حمایت ہی کریں گی۔'' شاہد نے بھنا کر کہا اور اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اگلے روز شازیہ خود شاہد کو منانے پہنچ گئی۔ اُس کے ساتھ ننھی روشن آنکھوں والا ارسلان بھی تھا۔ وہ بڑی زیرک تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس مرتبہ شاہد کا غصہ ہمیشہ سے زیادہ ہے۔ وہ اپنی مدد کے لئے اپنا ننھا معاون بھی ساتھ لائی تھی۔ وہی فرشتہ صورت چہرہ جس کا معصوم تبسم شاہد کے اُداس ہونٹوں پر مسکراہٹ کی روشن لکیر کھینچتا تھا۔ وہ اب ایک سال کا ہو چکا تھا۔

شاہد اس وقت اپنے کمرے میں تھا۔ وہ بالکل اکیلا تھا۔ اس کی والدہ گلبرگ واپس جا چکی تھیں۔ شازیہ نے آتے ہی بڑے انداز سے ارسلان کو اُس کی گود میں ڈال دیا تھا۔ شاہد نے بے پروائی سے اُسے بستر پر لڑھکا دیا۔

''ہائے اللہ! بچے کا کیا قصور ہے؟'' وہ مصنوعی غصے سے بولی۔ ''خبردار جو میرے بچے کو کچھ کہا۔ جو کچھ کہنا ہے، مجھ سے کہو۔''

شاہد نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب غصے سے میز پر پٹخی اور لحاف سر تک کھینچ کر لیٹ گیا۔

وہ کچھ دیر گھر میں اِدھر اُدھر گھومتی رہی۔ کچن میں جا کر ارسلان کا دودھ بنایا۔ پھر ارسلان کو لے کر شاہد کے قریب آ بیٹھی۔ ارسلان سے مخاطب ہو کر حسب عادت توتلی زبان میں بولی۔ ''منے نے دیکھا، منے کے ابو کتنے غصے والے ہیں، کتنے کڑوے کسیلے ہیں، کتنے رُوکھے سوکھے ہیں۔ منے کو کتنے زور سے بستر پر پھینکا۔''

منا بھی ایک آفت تھا۔ اُس نے رونا شروع کر دیا۔ ''اوئے، تم تو سچ مچ رونے لگے۔'' اُس نے منے کو ڈانٹا۔ ''میں تو تمہارا موڈ بنا رہی تھی۔''

وہ چپ ہوا تو وہ پھر بولنے لگی۔ ''پاپا دان سے کہو! ماما تجھے کیوں نہیں بولتے ہو۔ ماما کا کیا گناہ ہے؟''

منے نے لحاف کا کونا کھینچنا شروع کیا۔ ''ہاں ذرا زور لگاؤ تھوڑا سا اور شاباش۔'' وہ اُسے ہدایات دے رہی تھی۔

شاہد نے جھنجھلا کر کروٹ بدلی۔ منے کے ہاتھ سے لحاف چھوٹ گیا۔ وہ دور جا گرا۔ شازیہ نے جلدی سے بڑھ کر منے کو اُٹھایا۔ وہ بلند آواز میں رونے لگا تھا۔ شازیہ نے لحاف کے اُوپر سے ہی شاہد کو جھنجھوڑ دیا۔ ''بھئی اتنا بھی کیا غصہ۔ دیکھو تم نے منے کو رُلا دیا۔ اچھے باپ ہو تم۔''

شاہد ٹس سے مس نہیں ہوا۔ آج شازیہ کی کوئی ادا بھی اُس پر اثر انداز نہیں ہو رہی تھی۔ وہ منے کو اُٹھا کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ بہت دیر اُسے سلانے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ سو گیا تو وہ پھر اُس کے پاس آ گئی۔ ایک بار پھر اُسے منانے لگی۔ کبھی اُس کا لحاف کھینچتی، کبھی گدگدانے کی کوشش کرتی، کبھی اُس کی بند آنکھوں کو انگلیوں سے کھولنے کا جتن کرتی۔ وہ بار بار بے حد بیزاری سے اُس کا ہاتھ جھٹک رہا تھا۔ پھر گرج کر بولا۔ ''تم یہاں سے جاتی ہو یا میں چلا جاؤں؟''

''اچھا اچھا، میں جاتی ہوں۔'' وہ جلدی سے بولی۔

اُٹھ کر دروازے کی طرف گئی اور دروازہ اندر سے لاک کر کے چابی اپنے گریبان میں ڈال لی۔ اس کے بعد شاہد کے سرہانے آ بیٹھی۔ ایسے موقعوں پر شاہد حیران رہ جاتا تھا۔ وہ ایک مشہور و معروف سماجی شخصیت کی بجائے ایک عام گھریلو لڑکی نظر آنے لگتی تھی۔ سادہ، معصوم سا اور ایک دلفریب نسوانیت لئے ہوئے۔ وہ بستر پر بیٹھے بیٹھے شاہد پر لدی سی گئی۔ اُس کے ریشمی لباس کی سرسراہٹ ایک سرگوشی کی طرح شاہد کے کانوں میں گونجنے لگی۔ لیکن وہ اس سرگوشی کے مفہوم سے کان بند کئے ہوئے تھا۔ وہ کچھ دیر غور سے اُس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر ملائمت سے بولی۔ ''اچھا بابا معاف کر دو...... یہ دیکھو! ہاتھ جوڑ دیتی ہوں۔''

شاہد کی آنکھیں مسلسل بند تھیں۔ ہونٹ بے حد مضبوطی سے بھنچے ہوئے تھے۔ وہ اپنے

بند ھے ہوئے ہاتھ اُس کے چہرے سے چھوانے لگی۔ اُس کے رُخساروں سے، اُس کے ہونٹوں سے، اُس کی ٹھوڑی سے۔

''او نواب صاحب! آنکھیں تو کھولو۔'' وہ احتجاجی لہجے میں بولی۔ شاہد نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ وہ اُس پر ڈھیری ہو گئی۔ ''پلیز بس کرو اب۔''

وہ اُسے منانے میں طاق ہو چکی تھی۔ لیکن اُس کے ساتھ ساتھ شاہد بھی ناراض ہونے میں طاق ہو چکا تھا۔ وہ اب آسانی سے غصہ نہیں تھوکتا تھا۔ اُس نے شازیہ کی اداؤں کو بے اثر کرنا سیکھ لیا تھا۔

شازیہ نے بڑے شیریں لہجے میں شاہد کو بتایا کہ وہ ایک ہفتے کے لئے اپنے سارے پروگرام کینسل کر کے اُس کے پاس آئی ہے اور ایک ہفتے مسلسل اس کے سر پر سوار رہے گی۔ وہ چھیڑ چھاڑ کے ساتھ ساتھ اُس کی منت سماجت بھی کر رہی تھی۔ لیکن اُس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ پتا نہیں آج کیسی گرہ پڑ گئی تھی اُس کے دل میں۔ شازیہ شاہد کو مناتے مناتے اس حد پر پہنچ گئی تھی کہ جہاں کوئی محبوب ادا اُس کو متاثر نہیں کر رہی تھی۔ یہ ایک سنگین مقام تھا اور وہ دونوں اس ''مقام'' کی اہمیت سے بے خبر تھے۔ خاص طور پر شاہد تو بالکل ہی لاعلم تھا۔ شازیہ کو جھٹک کر وہ تیزی سے اُٹھا تو اُس کی کہنی شازیہ کے چہرے سے ٹکرائی۔ اُس کے ہونٹوں پہ چوٹ لگی اور منہ سے بے اختیار ''ہائے'' نکل گئی۔ اُس نے اپنا ہاتھ سے اپنے ہونٹ دبا لئے تھے۔ شاہد نے ٹانگیں بستر سے نیچے لٹکا دی تھیں اور سلیپر پہن رہا تھا۔ شازیہ جو بڑی دیر سے منت سماجت میں مصروف تھی، ایک دم بھڑک اُٹھی۔ اُس نے کندھے پر سے شاہد کی قمیص تھام لی اور اُسے جھنجھوڑتے ہوئے چیخی۔

''کیا بات ہے شاہد؟ کیا گناہ کیا ہے میں نے؟ کیوں کر رہے ہو ایسا میرے ساتھ؟''

شاہد پھنکارا۔ ''چھوڑ دے مجھے۔ میں کہتا ہوں پیچھے ہٹ جا!''

شازیہ نے اور مضبوطی سے قمیص تھام لی۔ ''نہیں چھوڑوں گی۔ پہلے مجھے بتاؤ کیوں کرتے ہو ایسا میرے ساتھ؟ کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا؟'' اُس کے نچلے ہونٹ سے خون رس رہا تھا۔

''میں کہتا ہوں قمیص چھوڑ!'' شاہد گرجا۔ پھر اُس نے پورے زور سے شازیہ کو دھکا دیا۔ یہ غصے میں بھرے ہوئے مرد کا بے رحم دھکا تھا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی بستر سے گری اور

مایذ بورڈ سے جا ٹکرائی۔ اُس کا سر بڑے زور کے ساتھ دیوار سے لگا تھا۔ شاہد نے مایذ ٹیبل کی دراز سے کمرے کی دوسری چابی نکالی اور پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔

وہ پورے چوبیس گھنٹے بعد گھر واپس آیا تھا۔ اس وقت تک شازیہ ارسلان کو لے کر اپنے ذاتی گھر جا چکی تھی۔ اپنے گھر کے بیرونی دروازے کی چابی شاہد کو پڑوسیوں سے ملی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ شازیہ بہت غصے میں گئی ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ شاہد کے غصے کے جواب میں اُس نے بھی غصہ دکھایا تھا۔ تاہم شاہد کو معلوم تھا کہ وہ زیادہ دیر ناراض نہیں رہ سکے گی۔ زیادہ سے زیادہ دو تین دن بعد اُس کا فون آ جائے گا۔ لیکن جب ایسا کوئی فون نہیں آیا تو نہ جانے کیوں شاہد کے ذہن میں ایک بھولا بسرا فقرہ گونجنے لگا۔ ایک بار شازیہ نے کہا تھا۔ ''اگر کبھی رُوٹھ گئی تو منا نہیں سکو گے۔ کیونکہ تمہیں منانا آتا ہی نہیں ہے۔''

''کیا واقعی ایسا ہو گیا تھا ؟ کئی برس تک اُسے منانے کے بعد وہ خود اُس سے رُوٹھ گئی تھی۔

تیسرے روز شاہد کی والدہ بھی آ گئیں۔ وہ بہت پریشان تھیں۔ کہنے لگیں۔ ''شاہد! تم نے کیا کہا ہے، شازیہ بیٹی سے؟ اُس نے تو رو رو کر برا حال کر لیا ہے۔ نہ کسی سے ملتی ہے، نہ بات کرتی ہے۔''

شاہد کے بدن میں سرد لہر دوڑ گئی۔ تاہم اُس نے اپنی فکرمندی چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دی۔ بے پرواہی سے بولا۔ ''میں نے اُسے کچھ نہیں کہا۔ بس اُس کے اپنے دماغ کا فتور ہے۔''

''مجھے تو تمہارے دماغ کا فتور لگتا ہے۔'' والدہ نے بیزاری سے کہا۔ ''وہ کہاں ہے کسی سے ناراض ہونے والی؟ اُسے تو آتا ہی نہیں ہے ناراض ہونا۔ ضرور تم ہی نے کچھ کہا ہے۔ اُس کے ماتھے پر پٹی بھی بندھی ہوئی ہے۔ میں بہت پوچھتی رہی ہوں لیکن اُس نے کچھ نہیں بتایا۔''

''کہا نا میں نے کچھ نہیں کیا اُس کے ساتھ۔'' شاہد نے بھڑک کر کہا اور اُٹھ کر چلا گیا۔

○

شاہد کی والدہ کی جان جیسے شکنجے میں آ گئی تھی۔ وہ جتنا پیار بیٹے اور پوتے سے کرتی تھیں اُتنا ہی بہو سے بھی کرتی تھیں۔ وہ کبھی شاہد کے پاس سمن آباد آتی تھیں، کبھی شازیہ

کے پاس گلبرگ جاتی تھیں۔ ان دونوں کو سمجھانے کی مسلسل کوشش کر رہی تھیں لیکن بہتری کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ شازیہ واقعی بہت ناراض تھی۔ اُس نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔ یہ بات عیاں تھی کہ زیادتی شاہد کی طرف سے ہوئی تھی۔ اصولی طور پر اُسے شازیہ کو منانا چاہئے تھا لیکن وہ اپنی جگہ اکڑا ہوا تھا۔ اُس نے ماں سے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ ان کی ہر بات مانے گا لیکن شازیہ کو منانے نہیں جائے گا۔

ماں کئی روز پریشان حال رہی تھیں۔ پھر وہ اپنا سامان لے کر بیٹے کے گھر سمن آباد آ گئی تھیں۔ شازیہ ننھے ارسلان کے ساتھ اپنے میکے یعنی گلبرگ والے گھر میں ہی رہی تھی۔

وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ تنہائی میں بیٹھ کر شاہد اکثر اس مسئلے کے بارے میں سوچتا۔ آخر اُس رات وہ اتنا سخت دل کیوں ہو گیا تھا کہ شازیہ کی ہر التجا اس پر رائیگاں گئی؟ اُس نے کیوں لاڈ پیار سے بگڑے ہوئے ضدی بچے جیسا رویہ اختیار کیا اور پھر وہ بات بھی کچھ ایسی سنگین نہیں تھی جو ناراضگی کا سبب بنی۔ رات گئے شازیہ کو پہلے بھی ڈسٹرب کیا جاتا رہا تھا۔ وہ مصروف ہی اتنی تھی۔ پھر الیکشن بھی بالکل سر پر پہنچا ہوا تھا۔ ایسے میں افراتفری تو ہوتی ہی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ ''مداخلت'' پر ناراض نہ ہوا ہو بلکہ ''مداخلت'' کرنے والے پر ناراض ہوا ہو۔ مداخلت کرنے والا ڈاکٹر درّانی تھا۔ کبھی کبھی شاہد کے ذہن میں خواہ مخواہ یہ بے بنیاد وہم جاگتا تھا کہ کہیں ڈاکٹر درّانی بتدریج شازیہ کے قریب نہ آ جائے۔ وہ کام کے سلسلے میں اکثر اکٹھے رہتے تھے۔ کبھی کبھی رات گئے تک دفتر میں موجود ہوتے تھے۔ ایک طرح سے ڈاکٹر درّانی، شازیہ کے مشیر خاص کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ شاید شاہد کے تحت الشعور میں کہیں یہ بات موجود تھی کہ ڈاکٹر درّانی مستقبل قریب یا بعید میں اُس کا رقیب ثابت ہو سکتا ہے۔

وہ اس بارے میں جتنا سوچ رہا تھا اتنا ہی خود کو قصوروار محسوس کر رہا تھا۔ یہ اُس کے دل کی گواہی تھی کہ شازیہ ایسی نہیں ہے۔ وہ صرف اور صرف اس سے محبت کرتی ہے۔ ڈاکٹر درّانی اس کے لئے صرف ہم کار ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ پھر ایسے بے سروپا خیالات اُس کے ذہن میں کیوں آ رہے تھے؟ شاید اس لئے کہ شاہد دل کی گہرائیوں سے شازیہ کو چاہتا تھا۔ جہاں چاہت بہت زیادہ ہوتی ہے وہاں ایسے بے معنی اندیشے بھی سر اُٹھاتے رہتے ہیں۔ وہ کئی دن اپنے رویے کے بارے میں سوچتا رہا اور نادم ہوتا رہا۔

اُس نے ذہنی طور پر تسلیم کر لیا کہ غلطی ہر لحاظ سے اس کی اپنی تھی اور اب یہ اس کی ذمہ
داری ہے کہ وہ شازیہ کے پاس جائے، اُس سے معافی مانگے اور اُسے منائے۔ لیکن
یہ سب کچھ کرنا شاہد کے لئے اتنا ہی دشوار تھا جتنا سینکڑوں فٹ کی بلندی سے براہِ راست
زمین پر چھلانگ لگانا۔ وہ جب بھی اس بارے میں سوچتا تھا، اُس کے دل سے آواز آتی
تھی نہیں وہ ایسا نہیں کر سکے گا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکے گا کہ وہ سر جھکا کر شازیہ کے سامنے
جائے اور اُس سے کہے کہ وہ اسے معاف کر دے۔ ایسا سوچتے ہوئے اُسے ایک ایسی
توہین کا احساس ہوتا تھا جو اُس کی رُوح تک کو مجروح کر دیتی تھی۔ اُس کی حیثیت، انا،
عزت، مردانگی سب کچھ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتا تھا۔ شاید شازیہ نے اُس کے ناز اُٹھا
اُٹھا کر اسے خود پسندی کے ایسے تخت پر بٹھا دیا تھا جہاں سے اُترنا اُس کے لئے ممکن نہیں
رہا تھا۔ وہ روٹھتا رہا تھا اور وہ مناتی رہی تھی۔ اُسے صرف اشک بہانا آیا تھا اور اُسے
معلوم ہی نہیں تھا کہ اشک شوئی کیسے کی جاتی ہے۔

سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی اُسے اپنے دل پر اختیار نہیں تھا۔ ایک بار تو ایسا
بھی ہوا کہ وہ جی کڑا کر کے شازیہ کو منانے نکل کھڑا ہوا۔ اپنے بچے اور بیوی کی صورتیں
اس کی نگاہوں میں گھوم رہی تھیں۔ اپنی ماں کی التجاؤں کی بازگشت اُس کے کانوں میں
تھی۔ وہ جانتا تھا، شازیہ اس کی منتظر ہے۔ وہ ایک آنکھ بن کر رات دن اُس کا انتظار کر
رہی ہے۔ اگر اس کی اشک شوئی کے لئے دو الفاظ بھی کہہ دے گا تو وہ سسک کر اُس کے
سینے سے لگ جائے گی، سارے شکوے گلے بھول جائے گی، پھر وہی پہلی سی شازیہ بن
جائے گی۔ لیکن یہ دو لفظ بولنا ہی تو شاہد کے لئے مشکل تھا۔ وہ شازیہ کے گھر کے پاس
سے ہی واپس آ گیا تھا۔

یوں ہوا کہ میاں بیوی کے درمیان خلیج روز بروز وسیع ہوتی چلی گئی۔ شاہد کی سمجھ میں
نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ قصور یقیناً اُس کا تھا، لیکن شازیہ بھی تو پتھر بن کر رہ گئی
تھی۔ ہفتے میں ایک آدھ بار شاہد کی والدہ [illegible] جاتی تھیں اور بہو اور پوتے سے ملتی تھیں
اور آنکھوں میں آنسو سمیٹ کر واپس آ جاتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ ارسلان کو بھی اپنے ساتھ لے
آتی تھیں۔ ننھا ارسلان چند گھنٹے باپ کے پاس رہتا تھا اور پھر واپس بھیج دیا جاتا تھا۔ وہ
ابھی بہت چھوٹا تھا۔ بمشکل ڈیڑھ سال کا۔ اُسے معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کے حسین بچپن کو

آغاز سے ہی ''محرومیوں'' کے ہاتھ گروی رکھ دیا گیا ہے۔ اسے جنم دینے والوں نے اپنی اپنی آغوش میں انا کے سانپ بٹھا لئے تھے اور اس کی معصوم اٹھکیلیوں کو در بدر کر دیا تھا۔

شازیہ کا دائرۂ کار اب وسیع ہو گیا تھا۔ اُس نے ایک ٹرسٹ قائم کیا تھا اور اپنی نگرانی میں چلنے والے تمام اداروں کو اسی ٹرسٹ کے زیرِ انتظام کر دیا تھا۔ ٹرسٹ کی روحِ رواں وہ خود تھی۔ تاہم یہ بات شاہد کے لئے حیرانی کا باعث تھی کہ شازیہ نے سیاست کے میدان میں قدم رکھنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ علاقے کے لوگ بڑے یقین سے کہہ رہے تھے کہ اگر وہ آئندہ الیکشن میں حصہ لے تو اُس کی کامیابی سو فیصد یقینی ہے۔ مگر اُس نے ایسی تجویز کو یکسر ٹھکرا دیا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے شہرت کی منازل طے کر رہی تھی۔ اُس کے انٹرویوز اور اُس کے بارے میں آرٹیکل آئے دن اخبارات کی زینت بنتے رہتے تھے۔ اُس کی مصروفیت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اُس نے خود کو ہمہ تن فلاحی کاموں میں جذب کر دیا ہے۔ جہاں تک کاروبار کی بات تھی وہ اس قدر اسٹیبلش ہو چکا تھا کہ اگر اُسے نہ بھی چلایا جاتا تو وہ زبردستی چلتا رہتا۔

اسی دوران میں ایک اتفاق کے تحت شاہد کی ملاقات شازیہ کے والد مسٹر احسان سے بھی ہو گئی تھی۔ وہ کچھ روز کے لئے پاکستان آئے ہوئے تھے۔ ایک دن وہ خصوصی طور پر شاہد سے ملنے اُس کے گھر پہنچے تھے۔ مسٹر احسان سے مل کر شاہد کا وہ تصور چکنا چور ہو گیا تھا جو اس نے ان کے بارے میں قائم کر رکھا تھا۔ شاہد کی نگاہ میں مسٹر احسان کا ''امیج'' ابھی تک مظلوم شوہر کا تھا جو شاہراہِ حیات پر اپنی تیز رفتار بیوی کا ساتھ نہیں دے سکا تھا اور سب کچھ چھوڑ کر کنارہ کش ہو گیا تھا۔ لیکن مسٹر احسان ایک بالکل مختلف آدمی تھے۔ اُن سے مل کر اور باتیں کر کے شاہد کو خاصی مایوسی ہوئی اور اس کے ساتھ یہ خیال بھی اُجاگر ہوا کہ مسز ثریا احسان کے متعلق اُس کے پہلے خیالات درست نہیں تھے۔ مسٹر احسان اگر اپنی بیوی سے کنارہ کش ہوئے تھے تو اس کی وجہ مسز ثریا کا لائف اسٹائل نہیں تھا، مسٹر احسان کی اپنی دلچسپیاں تھیں۔ وہ امریکہ گئے تھے اور وہاں ایک عورت کے عشق میں گرفتار ہو گئے تھے اور چوری چھپے شادی کر لی تھی۔ مسز ثریا نے طلاق تو نہیں لی مگر مسٹر احسان سے دوبارہ ملنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ مسز احسان نے اپنی تنہائیوں کا علاج ''سماجی خدمت'' میں ڈھونڈا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ کاروبار کو بھی ترقی دی تھی۔ اُن کی زندگی میں ''مسٹر

ان وہ اتنی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ وہ پاکستان آتے اور پہلی بیوی کو اپنی صورت دکھاتے۔ ان کے مرنے کے بعد وہ یہاں آئے تھے اور وہ بھی اس لئے کہ اثاثوں میں ان کا جو حصہ بنتا تھا وہ حاصل کریں اور واپس امریکہ چلے جائیں۔ وہ پانچ چھ ہفتے پاکستان میں رہے اور اپنا ''حصہ'' وصول کرنے کے بعد، بیٹی کو اُس کے حال پر چھوڑ کر واپس امریکہ چلے گئے تھے۔

بہرحال شاہد کو ان معاملات سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اور طرز کا بندہ تھا۔ اُس کے مسائل اور اُس کے غم کچھ اور طرح کے تھے۔ شازیہ کی تیز رفتار زندگی کے برعکس اُس کی زندگی بالکل عام سے انداز میں چل رہی تھی۔ چل کیا رہی تھی گھسٹ رہی تھی۔ صبح دفتر جاتا۔ پانچ بجے واپسی، شام کو تھوڑی دیر کے لئے موٹر سائیکل پر آؤٹنگ کے لئے نکل جاتا۔ نہر کے ساتھ ساتھ خوبصورت سڑک پر وہ دُور تک جاتا۔ راستے میں نیوکیمپس اور گرد و نواح کا علاقہ اُس کے سامنے آتا۔ پرانے مناظر نگاہوں میں تازہ ہو جاتے۔ ایک ایک درخت، ایک ایک گوشہ ایک کہانی سناتا۔ رات کو کھانا کھا کر وہ کچھ دیر ٹی وی دیکھ کر سو رہتا۔ چھٹی کے دن اکثر اُس کی والدہ ارسلان کو لے آتیں۔ یوں چار پانچ گھنٹے قدرے مختلف انداز میں گزرتے۔ ارسلان اب توتلی زبان میں باتیں کرتا تھا۔ بالکل جیسے اُس کی ماں کبھی لاڈ سے کیا کرتی تھی۔ ارسلان کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ شازیہ اس پر خاص توجہ دے رہی ہے۔ انگریز آیا کو ہٹا دیا گیا تھا۔ اب شازیہ گھر سے باہر ہوتی تو ایک قریبی عزیزہ ارسلان کی دیکھ بھال کرتی تھی۔

ارسلان کی باتوں میں شاہد کو شازیہ کی باتوں کی بازگشت سنائی دیتی۔ اُس کی آنکھوں میں شازیہ کی صورت جھانکتی۔ وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہوئے بھی بہت دور تھے۔ اس دوری کو صرف شاہد پاٹ سکتا تھا لیکن اسے پاٹنا اُس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ ''حرف معذرت'' اُس کی زبان پر آ ہی نہیں سکتا تھا جس کے لئے شازیہ کے کان ترس گئے تھے پتا نہیں ایسا کیوں تھا؟

○

ڈیڑھ دو سال یہ سلسلہ چلتا رہا۔ پھر شاہد کی والدہ بھی اُس سفر پر روانہ ہوگئیں جس پر ہر کسی کو جانا ہے مگر لوٹ کر کسی کو نہیں آنا۔ وہ اسے داغِ مفارقت دے گئیں۔ شاہد دنیا میں

یکسر تنہا رہ گیا۔ ماں آناً فاناً روانہ ہوئی تھیں۔ شاہد کو خدمت کا موقع ہی نہیں ملا۔ شازیہ کو بھی اس وقت پتہ چلا جب وہ اس دنیا میں نہیں تھیں۔ وہ آنسو بہاتی ماں کی میت پر آئی تھی، میت سے لپٹ کر دیر تک روتی رہی اور پھر ویسے ہی واپس چلی گئی تھی جیسے ایک ایک کر کے سب اپنے اپنے گھروں میں چلے گئے تھے۔

والدہ کی وفات کے بعد شاہد کو یوں محسوس ہوا جیسے شازیہ کے ساتھ اُس کا برائے نام رابطہ بھی ختم ہو گیا ہے جو اب تک قائم تھا۔ اُسے معلوم تھا اب کوئی ارسلان کو اُس کے پاس لے کر نہیں آئے گا اور وہ خود بھی اُسے دیکھنے نہیں جا سکتا تھا۔ ارسلان کی شکل میں اُس کی زندگی کو جو واحد دلچسپی میسر تھی وہ بھی ختم ہو رہی تھی۔ ایک دن بیٹھے بٹھائے اُس کے دل میں نہ جانے کیا آئی کہ وہ اُٹھا اور چچا عاطف کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہی چچا تھے جن کے ساتھ شاہد کے والد کی پارٹنر شپ تھی۔ والد کی وفات کے بعد چچا عاطف سارا کام دیکھ رہے تھے۔ اُن کی دیانت داری اور محبت ہر شبہے سے بالاتر تھی۔ یہی وجہ تھی کہ شاہد نے آج تک کبھی فیکٹری جا کر نہیں دیکھا تھا۔ چچا کئی مرتبہ حساب کتاب لے کر اُس کے پاس آئے تھے لیکن والدہ کی طرح اُس نے بھی کبھی اس حساب کتاب پر نظر ڈالنا گوارا نہیں کی تھی۔ آج اُس کا دل چاہا کہ وہ چچا کے پاس جائے اور کاروبار کے بارے میں باتیں کرے، بزنس کی اُونچ نیچ سمجھے۔ یہ بات نہیں تھی کہ خدانخواستہ اُسے اپنے کاروبار یا منافع کی فکر تھی۔ وہ اس طرز کا شخص ہی نہیں تھا۔ اُس کے دل میں ایک اور بات تھی۔ آج برسوں بعد اُس کا دل چاہا تھا کہ وہ اپنے کاروبار میں دلچسپی لے۔ معلوم نہیں ایسا کیوں ہوا تھا؟ بہر حال ایسا ہوا تھا۔

دو تین دن کے اندر چچا نے اُسے بہت کچھ بتا دیا۔ اُن کی چرمی جیکٹس کی مانگ اب بیرون ملک بھی پیدا ہو گئی تھی۔ پچھلے مہینے چچا نے انگلینڈ میں جیکٹوں کی دوسری کھیپ بھیجی تھی اور نتائج حوصلہ افزا تھے۔ اُنہوں نے بتایا کہ اگر لندن میں اپنا سیل پوائنٹ ہو تو بہت منافع کمایا جا سکتا ہے۔ چچا نے کوشش کر کے اپنے بڑے بیٹے توقیر کو لندن بھیجا تھا لیکن وہ وہاں کوئی مناسب ٹھکانا نہیں ڈھونڈ سکا تھا اور ڈیڑھ دو ماہ تک خوار ہو کر کے واپس آ گیا تھا۔ اب چچا خود وہاں کا چکر لگانے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ یہ سن کر چچا کو حیرت آمیز خوشی ہوئی کہ شاہد لندن جانے پر آمادہ تھا۔ شاہد کی ایک بہن لندن میں

ا ں ہوئی تھی۔ اُس کے توسط سے ویزا لگوانے میں بھی کچھ آسانی پیدا ہو سکتی تھی۔
شاہد نے جو کچھ سوچا تھا، بڑے پختہ ارادے کے ساتھ سوچا تھا۔ وہ تہیہ کر چکا تھا کہ لندن میں کام بن گیا تو وہ ملازمت سے استعفیٰ دے دے گا۔ جس دوران میں ویزا لگوانے کی کوشش کی جا رہی تھی، شاہد نے چچا سے کاروبار کے متعلق کافی کچھ سمجھ لیا تھا، خام مال کہاں سے آتا ہے، لیبر کتنی پڑتی ہے، سپلائی اور ڈیمانڈ کے حالات کیا ہیں وغیرہ وغیرہ۔
جونہی اُسے ویزا ملا، وہ لندن جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ وہ عارضی طور پر لندن جا رہا تھا لیکن پتا نہیں کیوں اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ جانے سے پہلے وہ ایک بار شازیہ اور ارسلان کو دیکھ لے۔ کوئی چیز اُسے بار بار اپنے پیاروں کی طرف کھینچ رہی تھی۔ کوئی غم تھا جو برابر اُس کے دل میں اندیشے جگا رہا تھا۔ ارسلان تو گھر میں رہتا تھا۔ اُس کو دیکھنا مشکل تھا لیکن شازیہ کو ایک نظر دیکھا جا سکتا تھا۔ شاہد کو اُس کے معمولات کا پتا تھا۔ وہ روزانہ صبح نو بجے گھر سے ٹرسٹ کے دفتر کے لئے روانہ ہو جاتی تھی۔ وہ ایک روز اپنے ہمسائے کی سوزوکی گاڑی میں گلبرگ پہنچا اور گاڑی اُس راستے میں کھڑی کر دی جہاں سے شازیہ کو گزرنا تھا۔ شازیہ مقررہ وقت پر اپنی شاندار مرسیڈیز میں وہاں سے گزری۔ اُس کے ساتھ باوردی ڈرائیور تھا۔ شاہد نے اپنی گاڑی کے اندر سے اُس کی صرف ایک جھلک دیکھی اور ایک طویل آہ بھر کر واپس آ گیا۔ اگلے روز وہ لندن کے لئے روانہ ہو گیا تھا۔
لندن میں شاہد کو توقع سے زیادہ کامیابی ملی۔ وہ اپنی دانست میں عارضی طور پر لندن گیا تھا لیکن یہاں ایسا پکا بندوبست ہوا کہ وہ مستقل وہیں ٹک گیا۔ اپنے بہنوئی کی مدد سے اس نے نہ صرف ایک اچھی دُکان حاصل کر لی بلکہ ایک ہوشیار وکیل کی نکتہ آفرینیوں کے طفیل اُسے لندن میں غیر معینہ مدت کا ''اسٹے'' بھی مل گیا۔ دُکان ملتے ہی چچا نے اِدھر سامان بھیجنا شروع کر دیا۔ شاہد کا بہنوئی بھی اس سلسلے میں کافی ہوم ورک کر چکا تھا۔ نہ صرف وہ یہ سامان اپنی دُکان پر بیچنے لگے بلکہ دوسروں کو بھی سپلائی کرنے لگے۔ ہر آنے والا دن اُن کے لئے بہتر ثابت ہو رہا تھا۔ شاہد کو پہلی بار اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کا ادراک ہوا۔ اُسے یوں لگا کہ وہ سات ہزار روپے کی ملازمت میں خود کو ضائع کر رہا تھا، یا شاید یہ صلاحیتیں اور توانائیاں اُس میں اب پیدا ہوئی تھیں۔ بہت سی ٹھوکریں کھا کر اور غم جھیل کر اُسے معلوم ہوا تھا کہ زندگی سات ہزار روپے کی نوکری کا نام

نہیں، زندگی لندن کی شام میں جگمگاتا ہوا خوبصورت شوروم ہے اور زندگی وہ کامیابی ہے جو ڈالروں اور پاؤنڈوں سے بھرا ہوا بریف کیس اُٹھائے ہر صبح اُس کے اکاؤنٹ میں جمع ہوتی ہے۔ کام کی گوناگوں مصروفیات میں کبھی کبھی شاہد کو شازیہ اور ارسلان کا خیال یوں آتا تھا جیسے تاریک بادلوں میں بجلی کی سنہری لکیر تڑپ جائے۔ اس لکیر کے ساتھ وہ خود بھی تڑپ جایا کرتا تھا۔ وہ کتنا پتھر دل تھا اور اس سے بڑھ کر وہ پتھر دل تھی...... بیتے دنوں کی یادیں جوق در جوق اُس پر حملہ آور ہونے لگتیں۔ لیکن وہ تادیر اس حملے کی زد میں نہیں رہتا تھا۔ بہت جلد خود کو سنبھال لیتا تھا۔ اُس کی زندگی کا مقصد اب صرف اور صرف یہ تھا کہ خود کو "خوش حال تر" بنائے۔ وہ پاؤنڈوں کی گڈیوں سے ایک ایسا زینہ بنانا چاہتا تھا جو اُس کے اسٹیٹس کو وہاں لے جائے جہاں اب شازیہ تھی اور پھر شازیہ سے بھی اُوپر جہاں دیکھنے کے لئے شازیہ کو نگاہ اُٹھانی پڑے۔

دن ہفتوں میں بدلے اور ہفتے مہینوں میں وقت کی تیز ہوا چہروں کی ریت پر لکیریں بناتی گزرتی رہی اور اسی طرح نو سال بیت گئے شاہد کا شمار اب لندن کے صاحب حیثیت "تارکین وطن" میں ہوتا تھا۔ اُس کا کاروبار دو تین شہروں میں پھیلا ہوا تھا۔ پچھلے نو برسوں میں وہ ایک بار بھی پاکستان نہیں گیا تھا۔ کبھی چھٹیاں آتیں تو وہ انگلینڈ میں ہی گھوم پھر کر گزار لیتا۔ اور اب تو پچھلے دو برس سے مکمل فراغت کا شاید ایک دن بھی اُسے نہیں ملا تھا۔ وہ بہت تھک گیا تھا اس لئے موسم گرما کی چھٹیوں میں اُس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ چند دن کاروباری مصروفیت سے دُور رہ کر گزارے گا۔

وہ برمنگھم چلا گیا۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ اپنی "وزٹ" کے دوسرے روز وہ ایک باغیچے میں ایک پھولدار درخت کے نیچے لیٹا تھا اور چمکیلی دھوپ سے لطف اندوز ہو رہا تھا، اُس کے تصور کا پنچھی پر لگا کر اُڑا اور پہاڑوں، سمندروں اور ریگستانوں کو عبور کرتا اپنے وطن میں جا پہنچا لاہور میں، جہاں ایک چاردیواری میں وہ اپنی زندگی کا ایک حصہ چھوڑ آیا تھا۔ اُس کے خیال میں شازیہ کا چہرہ آیا اور ایک دم شاہد پر ایک عجیب انکشاف ہوا۔ ایک ایسا انکشاف جس نے اُسے جسم سے لے کر رُوح تک جھنجھوڑ دیا۔ وہ اپنی جگہ پتھر کی طرح ساکت لیٹا رہ گیا کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے؟ وہ بے پناہ حیرت سے سوچ رہا تھا۔

○

وہاں نہایت وسیع و عریض ہال میں ایک بہت بڑا کلچرل شو منعقد ہو رہا تھا۔ یہ شو اس اسپیشل بچوں کی امداد کے لئے تھا۔ بہت سے مخیر افراد کی آمد متوقع تھی اور اُمید تھی نقد عطیات کی صورت میں کافی بڑی رقم اکٹھی ہو جائے گی۔ شو کے منتظمین نے شازیہ کو بھی اس شو میں شرکت پر آمادہ کیا تھا۔ وہ آج کل بہت مصروف تھی۔ کچھ تو کام کی ذاتی۔ پھر ارسلان کو بھی معمول سے زیادہ وقت دینا پڑ رہا تھا۔ ارسلان کے امتحانات ہو رہے تھے۔ تین تین ٹیوٹر پڑھانے آ رہے تھے لیکن شازیہ جب تک خود ایک ڈیڑھ گھنٹہ اس کے ساتھ مغز ماری نہیں کر لیتی تھی اُسے چین نہیں آتا تھا۔ ارسلان اُس کی زندگی کا محور تھا۔ اب اُس نے ارسلان کے لئے وقت نکالنا سیکھ لیا تھا۔ ارسلان سے اہم اُس کے لئے بھلا اور کون ہو سکتا تھا؟ یہی تو ایک نشانی تھی اس ماضی کی جو اس سے ہمیشہ کے لئے کھو گیا تھا۔ وہ اب قریباً بارہ برس کا تھا لیکن وہ اب بھی اُسے گود میں لے کر بیٹھتی تھی، موڈ خوشگوار ہوتا تو توتلی زبان میں اُس سے باتیں کرتی۔ ارسلان ماں کی اس ادا پر خوب ہنستا۔ پھر وہ بھی توتلی زبان میں بولنے لگتا۔

وہ پوچھتی۔ ''میلا منا کھانا کھائے گا؟''

وہ بولتا۔ ''کھانا تو کھا لیا ہے۔ اب دودھ پیئے گا۔''

وہ اس کے بال کھینچتی۔ ''اتنا بالا (بڑا) ہو کر دودھ پئے گا؟''

''بابا اتنے بلے ہو کر کیا پیتے ہیں؟''

''اتنے بلے ہو کر دودھ پیتے ہیں۔'' وہ کہتی۔ دونوں بے ساختہ ہنسنے لگتے۔

ایسے ہی ہنستے کھیلتے کبھی شازیہ کی آنکھوں میں آنسو بھی آ جاتے۔ پتا نہیں کیوں۔

ارسلان پوچھتا۔ ''پاپا یاد آ رہے ہیں ماما؟''

''وہ بھولتے ہی کب ہیں؟'' وہ کہتی۔

''تو پھر اُن کو ڈھونڈیں نا!''

''وہ بہت دور ہیں۔ ہم سے بہت دُور ہیں۔''

پھر وہ بڑی صفائی سے بات کا رُخ بدل جاتی۔

شاہد کے بارے میں صرف اتنا ہی معلوم تھا کہ وہ پاکستان میں نہیں ہے، انگلینڈ میں

اُس نے اپنا ذاتی کام شروع کر رکھا ہے۔

ایک صبح جب ارسلان کو پتا چلا کہ شیڈول کے مطابق آج ماما کو کلچرل شو دیکھنے دبئی جانا ہے تو وہ یہ ضد ہو گیا کہ ساتھ جائے گا۔ شازیہ نے امتحان وغیرہ کا ڈراوا دے کر اُسے بمشکل منع کیا۔ دوپہر کی فلائٹ سے وہ دبئی پہنچی۔ وہاں ایک دو ضروری کام کئے، پھر کلچرل شو میں چلی گئی۔ نہایت شاندار، وسیع و عریض ہال تھا۔ شو دیکھنے والوں میں اکثریت ملکی وغیر ملکی معززین کی تھی۔ شیوخ کے علاوہ بڑے بڑے پاکستانی صنعتکار، بیورو کریٹس اور تاجر حضرات موجود تھے۔ کئی جانے پہچانے چہرے بھی نظر آ رہے تھے۔ شو کے درمیان جب وقفہ ہوا تو شازیہ کی نظر تھری پیس سوٹ میں ملبوس ایک دراز قد شخص پر پڑی۔ اُس کی عمر پینتیس چالیس سال تھی۔ پیشانی تھوڑی سی چوڑی تھی، نظر کے چشمے کے باوجود وہ اسمارٹ نظر آ رہا تھا۔ شازیہ نے اُسے غور سے دیکھا اور اُس کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ وہ شاہد تھا۔ وہ اُس کا جیون ساتھی تھا اور آج وہ قریباً دس سال بعد اس کی صورت دیکھ رہی تھی۔ ان دس سالوں میں وہ ایک دوسرے سے ملے نہیں تھے پھر بھی دل و جان سے ایک دوسرے کے رہے تھے، ایک دوسرے کو یاد کرتے رہے تھے، ایک دوسرے کو سوچتے رہے تھے۔ شاہد کی نظر ایک لمحے کے لئے جیسے شازیہ سے ملی اور شازیہ کے لئے گردشِ دوراں جیسے تھم گئی۔ اگلے ہی لمحے یہ لمحہ گزر گیا اور وہ دونوں دو مختلف اطراف میں دیکھنے لگے۔

وہ حیران تھی اور سوچ رہی تھی کہ شاہد یہاں کیوں نظر آیا ہے؟ کیا یہ محض ایک اتفاق ہے؟ شو کے دوران میں عطیات کا اعلان ہوا۔ شازیہ اپنی ساڑھی سنبھالتی سٹیج پر پہنچی۔ وہ اب لڑکی تو نہیں تھی، ایک بھرپور عورت تھی۔ تاہم اُس کی کشش میں ابھی کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ تالیوں کی گونج میں اُس نے ایک لاکھ روپے کے عطیے کا اعلان کیا۔ اس کے بعد بھی اعلانات ہوتے رہے۔ کسی نے لاکھ دیا، کسی نے دو لاکھ، کسی نے پچاس، کسی نے پچیس ہزار۔ آخر میں جو شخص سٹیج پر آیا وہ شاہد تھا۔ کمپیئر نے اُس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''یہ شاہد حمید ہیں۔ انٹرنیشنل لیدرز کے مالک۔ اس شو کے تمام انتظامات آپ ہی نے کئے ہیں۔ اس کام میں آپ کا بڑا حصہ ہے۔ آپ دبئی کی طرح دیگر جگہوں پر بھی اس طرح کے شوز منعقد کرانے کا عزم رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں کامیاب فرمائے۔'' دیر تک ہال تالیوں سے گونجتا رہا۔

اس کے بعد کمپیئر نے ہلکے پھلکے انداز میں شاہد سے چند سوالات کیے جن کے
جوابات بھی ہلکے پھلکے انداز میں دیئے گئے۔ کمپیئر شاہد سے خاصا بے تکلف نظر آتا تھا۔
اس موقع پر کہنے لگا۔ ''شاہد صاحب! آپ ہمارے بڑے پیارے دوست ہیں اور رحم
دل بھی ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ اتنے لوگوں کے سامنے مجھے پیٹیں گے نہیں۔ لہٰذا میں
آپ سے ایک نجی قسم کا سوال کرنا چاہتا ہوں۔''
''کیجئے!'' شاہد نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''لوگ کہتے ہیں، آپ اندھا دُھند پیسہ کما رہے ہیں... کس لئے؟''
شاہد بولا۔ ''اس کا جواب یہی ہے کہ میں اس ''نیک تقریب'' میں آپ کے سامنے
موجود ہوں۔''
''وہ تو بالکل ٹھیک ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ایسے کاموں کی مزید توفیق عطا فرمائے۔
میرا مطلب آپ کی ذاتی زندگی سے ہے۔''
''میں سمجھا نہیں؟''
کمپیئر مزاحیہ انداز میں بولا۔ ''دیکھئے جی! صاف سیدھی بات ہے، نہ آپ حسن کے
شیدائی ہیں، نہ آپ شراب پیتے ہیں، نہ آپ کو سیاست کا چسکا ہے، نہ آپ اچھا کھاتے
پیتے ہیں تو پھر کیوں؟ ... کیوں یہ بکھیڑے پال رکھے ہیں آپ نے؟''
سوال ہلکے پھلکے انداز میں کیا گیا تھا۔ شاہد نے بھی لطیف انداز میں جواب دیا۔
''بھائی میرے، اُمید پر دنیا قائم ہے۔ کل کیا ہو جائے کسے معلوم؟ آپ کا سوال اس لحاظ
سے قبل از وقت ہے کہ ابھی میں زیادہ بوڑھا نہیں ہوا۔''
تالیوں کی گونج میں شاہد سٹیج سے نیچے آ گیا۔
شازیہ جو کچھ شاہد کے بارے میں دیکھ اور سن رہی تھی، وہ حیرت ناک تھا۔ یہ تو اُسے
معلوم تھا کہ وہ ذاتی کاروبار کر رہا ہے لیکن یہ ہرگز خبر نہیں تھی کہ وہ اتنی ترقی کر چکا ہے۔
یقیناً اُس نے بلندی کا سفر بڑی تیزی سے طے کیا تھا
شو کے بعد ''ریفرشمنٹ'' تھی۔ جب سب لوگ چائے پی رہے تھے، شازیہ کی نگاہ نے
شاہد کو ڈھونڈ نکالا۔ وہ اُس سے صرف چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے
کو دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ دونوں کا درمیانی فاصلہ برقرار رہا۔ بے شک دس سال گزر

گئے تھے لیکن دونوں اپنی اپنی جگہ مضبوطی سے کھڑے تھے۔ شاید ایک انچ سرکنے کو تیار نہیں تھے۔ شازیہ کے دل نے گواہی دی، شازیہ! وہ کبھی تیری طرف نہیں آئے گا۔ کبھی حرف معذرت اپنی زبان پر نہیں لائے گا۔ تو صدیوں یونہی کھڑی رہی تو بھی نامراد رہے گی۔ چل تو ہی ہار مان لے۔ آگے بڑھ کر اس سے بات کرلے۔

اس سوچ نے اُس کے اندر کی عورت کو چکنا چور کر دیا۔ اُس کی عزت نفس زخم زخم ہو کر سسک اُٹھی۔ کیا مجھے زندگی میں ایک بار بھی ناراض ہونے کا حق نہیں تھا؟ اُس نے حد کرب کے ساتھ سوچا۔

اُسے لگا جیسے ابھی ابھی اُس نے شاہد کا دھکا کھایا ہے اور لڑکھڑاتی ہوئی فرش پر گری ہے۔ جیسے اُس کی جبیں سے رِسنے والا خون ابھی قطرہ قطرہ اُس کے ہاتھوں پر گر رہا ہے۔ اُس کے جبڑے بھینچ گئے، آنکھوں میں آتشیں نمی آگئی۔ اُس نے لبوں تک نہ پہنچنے والی ایک دل دوز آہ کے ساتھ شاہد کی طرف سے رُخ پھیر لیا۔

وہ ستے ہوئے قدموں کے ساتھ ہال سے باہر نکلی اور گاڑی میں بیٹھ کر اپنے ہوٹل روانہ ہوگئی۔ ہوٹل میں کمرہ بند کر کے وہ دیر تک روتی رہی۔ آتشیں آنسو اُس کی آنکھوں سے سیلاب کی طرح بہتے چلے جارہے تھے۔ 'سنگ دل، ظالم، بے حس' اُس نے دل ہی دل میں شاہد کو ایسے ان گنت خطاب دے ڈالے۔

اچانک دروازے پر ہونے والی مدھم دستک نے اُسے چونکا دیا۔ اُس نے جلدی جلدی آنسو پونچھے، لباس درست کیا۔ ''کون...؟'' اُس نے دروازے پر جا کر پوچھا۔

''میں عائشہ ہوں جی۔'' اُس کی پرائیویٹ سیکرٹری کی آواز آئی۔

شازیہ نے دروازہ کھولا۔ سامنے سیکریٹری کھڑی تھی اور اُس کے ساتھ شاہد تھا۔

''تھینک یو مس!'' شاہد نے سیکرٹری سے کہا۔ وہ واپس چلی گئی۔

اس سے پہلے کہ شازیہ کا سکتہ ٹوٹتا اور وہ کچھ کہتی یا کرتی، شاہد بڑے اعتماد سے اندر گیا۔ نہ صرف اندر آگیا بلکہ دروازہ بھی بند کر دیا۔ شازیہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ گر بیٹھی اُس کی نگاہوں میں چکرا رہے تھے۔ یہ انہونی کیسے ہو گئی تھی؟ یہ سوال ایک مہیب گونج کے ساتھ مسلسل اُس کے کانوں سے ٹکرا رہا تھا۔ پھر شاید وہ خود کو سنبھالنے کے لیے ہی بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

''بیٹھنے کے لئے نہیں کہو گی؟'' شاہد کی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔
آہ کتنے زمانے گزر گئے اس آواز کا انتظار کرتے ہوئے۔
''بیٹھ جاؤ!'' وہ سر جھکائے جھکائے بولی۔
شاہد صوفے پر بیٹھ گیا۔ اُس کے ہاتھ میں سگریٹ تھا۔ وہ ہلکے ہلکے کش لیتا رہا۔ کمرے میں ایک نہایت بے ڈھنگی خاموشی طاری تھی۔ سگریٹ بجھا کر اُس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''شازیہ! ابھی کچھ دیر پہلے تم میرے ساتھ ہال میں تھیں۔ وہاں مجھ سے ایک سوال پوچھا گیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ میں اتنی بھاگ دوڑ کیوں کرتا ہوں؟ کیا کروں گا میں اپنے کمائے ہوئے پیسے کا؟ شازیہ! یہ سوال اس سے پہلے بھی مجھ سے کئی بار پوچھا گیا ہے۔ میرے عزیزوں نے پوچھا ہے، ہمکاروں نے پوچھا ہے، یاروں نے پوچھا ہے، دوستوں نے پوچھا ہے۔ میں نے اس سوال کا کبھی کوئی مناسب جواب نہیں دیا۔ میرے پاس کوئی جواب تھا ہی نہیں۔ اس سوال کا جواب آج سے کوئی ایک ماہ پہلے مجھے معلوم ہوا بالکل اچانک، جیسے اندھیرے میں ہاتھ کسی سوئچ سے ٹکرا جائے اور کمرے میں روشنی ہو جائے۔'' ذرا توقف کر کے اُس نے کہا۔ ''تمہیں معلوم ہو گا کہ میں لندن میں تھا۔ آج سے تقریباً ایک مہینہ پہلے میں چند چھٹیاں گزارنے برمنگھم گیا تھا۔ وہاں ایک باغیچے میں لیٹے لیٹے اچانک اس سوال کا جواب میری سمجھ میں آیا تھا، اور یہ جواب سمجھ میں آنے کے فوراً بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں تم سے ملوں گا۔ بلکہ یہ شو جو آج تم نے میرے ساتھ دیکھا ہے، اس کی پلاننگ بھی شاید اُسی وقت ہو گئی تھی۔ مجھے یہ بات اچھی لگی کہ ہم دس سال بعد ایک دوسرے کو ایک خوبصورت تقریب میں دیکھیں۔''
شازیہ اُس کی باتوں کے جواب میں بالکل خاموش تھی۔ شاہد نے کہا۔ ''کیا تم وہ جواب سننا پسند نہیں کرو گی؟''
شازیہ نے اس بار بھی کچھ نہیں کہا۔
شاہد بولا۔ ''چلو، میں تمہیں خود ہی بتا دیتا ہوں۔ اُس روز باغیچے میں لیٹے لیٹے اچانک مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میرے لئے وہ بات کہنا بے حد ... بے حد آسان ہو گیا ہے جو کسی وقت بہت مشکل، بلکہ قطعی ناممکن تھا...... اور وہ بات پتا ہے کیا تھی؟ وہ بات تھی تم سے معافی مانگنے کی... معذرت چاہنے کی اور تب مجھ پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ

میں نے یہ ساری دولت اور حیثیت صرف اور صرف اس لئے بنائی ہے کہ میں تم سے معافی مانگنا چاہتا تھا۔ اس قابل ہونا چاہتا تھا کہ تم سے معافی مانگ سکوں۔ تمہارے سامنے اپنا سر شرمندگی سے جھکا سکوں۔"

شازیہ نے اشک بار نگاہیں اٹھائیں اور حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

وہ بولا۔ "میری بات عجیب لگی ہے نا؟ واقعی یہ عجیب بات ہے۔ لیکن یہ جو بھی ہے حقیقت ہے شازیہ! میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

اس نے اضطراری انداز میں سگریٹ کے لئے ہاتھ بڑھایا لیکن پھر ارادہ ترک کر دیا۔ سامنے دیوار کو گھورتے ہوئے بولا۔ "شازیہ! تمہیں یاد ہے، میں اکثر روٹھتا رہا اور تم ہمیشہ مناتی رہیں۔ شروع میں ایک دو بار تم بھی روٹھی تھیں لیکن میں تمہیں منا نہیں سکا تھا۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا تھا؟ میں نے جب بھی تمہیں منانے کا ارادہ کیا مجھے ایسا لگا جیسے اچانک میں بونا ہو گیا ہوں، حقیر اور بے وقعت شے بن گیا ہوں۔ جیسے میں کچھ بھی نہیں ہوں، اور تم ہی سب کچھ ہو اور میں تمہاری خوشنودی کے لئے اپنی منشا کے خلاف عمل کر رہا ہوں۔ لیکن پچھلے ماہ اس باغیچے میں لیٹے لیٹے جب میں نے تم سے معافی مانگنے کا سوچا تو مجھے یہ احساس نہیں ہوا۔ مجھے لگا جیسے "برتری" کی وہ دیوار میرے سامنے سے ہٹ گئی ہے جس نے مجھے تم سے دور رکھا ہوا تھا۔"

اس نے ذرا توقف کیا اور بولا۔ "شازیہ! آج میں بڑے اعتماد کے ساتھ تمہارے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کر سکتا ہوں۔ بہت دیر بعد ہی سہی، لیکن اب مجھے معافی مانگنا آ گیا ہے۔ میری طرف دیکھو شازیہ! پلیز میری طرف دیکھو۔ پلیز شازیہ!"

شازیہ کی اشک بار آنکھیں خود بخود شاہد کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ دنگ رہ گئی۔ شاہد کے ہاتھ جڑے ہوئے تھے۔ وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ "میں اپنا قصور مانتا ہوں شازیہ! میں نے تم سے بڑی زیادتی کی تھی۔ مجھے معاف کر دو!"

شازیہ تڑپ کر اس کے گلے لگ گئی۔ "اتنی دیر... اتنی دیر..." بے اختیار اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔ وہ رونے لگی اور بے قراری سے اپنا چہرہ اس کے سینے میں چھپانے لگی۔ شاہد نے اسے بانہوں میں بھر لیا... وہ دیوانہ وار اسے چومتا چلا گیا۔

○○○